کے اتوار، اور سردیوں کے موسم میں ہر دوسری اتوار۔ پہلی منزل والے میرپوری اپنے تین کمروں میں رہتے تھے اور آپس میں ہی میل ملاپ رکھتے تھے۔ دوسری منزل والے حافظ آبادیوں کا بھی یہی حال تھا حتیٰ دو بنگالی نوٹنوں ان کے بیچ میں پھنسے ہوئے تھے جو ہر وقت بنگالی بولتے رہتے تھے۔ مگر حافظ آبادی بنگالیوں سے خوب فائدہ اٹھاتے تھے ایک بنگالی کھانا پکانے کا ماہر تھا۔ وہ سارے حافظ آبادیوں کا کھانا پکایا کرتا تھا۔ دوسرا اپنی زبان کے علاوہ اردو انگریزی پڑھنا لکھنا جانتا تھا۔ وہ سب کی خط وکتابت کرتا اور خریداری کرکے لاتا تھا۔ ہفتے بھر کی خریداری کرنا سب سے مشکل کام تھا۔ خریداری کا مطلب تھا، دن کے وقت باہر جاکر دکانوں پر گھومتے پھرو اور بڑے بڑے تھیلے ہاتھوں میں لٹکا کر گھر لاؤ۔ راستے میں ہر ایک کی نظر پڑتی تھی۔ ان دنوں میں یہ کام خطرے سے خالی نہ تھا۔ فیکٹریوں میں ہم لوگ آزاد پھرتے تھے۔ حالانکہ وہاں پر ہر قسم کے لوگ موجود ہوتے تھے۔ مگر وہاں گورے ہم سے کام لیتے تھے، وہ ہماری حفاظت کے ذمہ دار تھے۔ ہمیں پتا تھا کہ وہ کبھی ہمیں ہاتھ سے جانے نہ دیں گے۔ ہم لوگ سب گندا اور سخت کام کرتے تھے اور بارہ بارہ گھنٹے حاضری دیتے تھے۔ اس زمانے میں اس ملک کے اندر خوش حالی تھی۔ فیکٹریاں خوب چلتی تھیں اور لیبر کی کمی تھی۔ ان کی اپنی لیبر تنخواہوں میں اضافے لے لے کر اتنی بگڑ گئی تھی کہ گندے مندے اور سخت کاموں پر راضی نہ ہوتی تھی۔ صفائی کا کام، لدان کا کام، برفوں کے موسم میں باہر کا کام ایسے کاموں پر یہ لوگ ہمیں لگاتے تھے۔ ہم لوگ نہ ناغہ کرتے تھے نہ چھٹی لیتے تھے، جو کوئی گورا غیر حاضر ہوجاتا تھا اس کی جگہ اوورٹائم کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے، اور اوپر سے تنخواہوں میں

اضافہ نہ مانگتے تھے۔ مالکوں کو ہماری اصلی حالت کا علم تھا یہ بھی کہ ہم جعلی کارڈوں پر کام کر رہے تھے۔ مگر مالک ہم سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ اس لیے درگزر سے کام لیتے تھے۔ کئی مالک ہماری انشورنس کے پیسے بھی حکومت کو ادا نہ کرتے تھے بلکہ اپنی جیب میں ڈال لیتے تھے۔ انھیں پتہ تھا کہ ہم لوگ دراصل فیکٹری کے ریکارڈ پر ہی نہ تھے۔ دوسرے لفظوں میں ہم وہاں پر موجود ہی نہیں تھے۔ مگر اس وجہ سے ہم فیکٹریوں میں آزادی محسوس کرتے تھے۔ اس جعل سازی کے مرکز میں ہماری سب سے بڑی حفاظت کا سامان موجود تھا۔ گھر سے بھی زیادہ جب ہم کام پر ہوتے تو بے خطر ہوتے تھے۔ مگر ہفتے بھر کی خریداری کے لیے باہر جانا الگ بات تھی۔ یہ خطرناک کام تھا۔ ہزاروں نا واقف لوگ ادھر ادھر پھر رہے ہوتے۔ خبریں آتی تھیں کہ ہمارے لوگ جب پکڑے جاتے تو عام طور پر دکانوں کے اندر خریداری کر رہے ہوتے تھے۔ جب کوئی سودے کے لیے باہر جاتا تو اوور کوٹ اور گرم ٹوپی پہن لیتا اور دکانیں بند ہونے کے وقت پر جاتا جب بہت سے لوگ گھر جا چکے ہوتے۔ ہر ایک کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ کوئی دوسرا ہی سودا سلف خریدنے کے لیے باہر جائے۔ پہلی اور دوسری منزل والوں کو تو بنگالی ہاتھ آ گئے تھے۔ بنگالی اتنے بھولے نہ تھے، مگر میرپوری اور حافظ آبادی بارہ تھے اور بنگالی صرف دو۔ اس لیے ایک بنگالی نے حافظ آبادیوں کا کھانا پکانے اور دوسرے نے دونوں منزلوں کی خریداری کرنے کا ذمہ لے لیا تھا۔ بدلے میں میرپوری اور حافظ آبادی انھیں آرام سے رہنے دیتے تھے۔ ہماری منزل پر پہلے میں اور حسین شاہ باری باری باہر جایا کرتے تھے۔ پھر ثاقب ہم میں شریک ہو گیا تو وہ بھی خوشی خوشی جانے لگا۔ نوعمر

لڑکا تھا اس لیے اسے ہماری طرح ڈر خوف نہ تھا۔ روز کے کام اور پہننے کی خریداری کے علاوہ ہمارا سارا وقت گھر میں ہی گزرتا تھا۔

کام پر جانے کی تیاری میں اور واپس آکر کھانا پکانے میں سارا وقت لگ جاتا تھا۔ اس کے بعد نیند پوری کرنی ہوتی تھی۔ گپیں مارنے کی مہلت کم ہی ملتی۔ کبھی کبھار مجھے اوور ٹائم نہ ملتا تو میں جلدی گھر واپس آجاتا۔ اس دن میں دو تین وقت کا سالن اکٹھا پکا لیا کرتا۔ پھر ٹاقب اور میں بیٹھ کر ادھر ادھر کی باتیں کرتے یا تاش کی بازی لگا لیتے۔

صرف اتوار کا ایک دن ایسا ہوتا جب گھر میں سب کی ایک دوسرے سے ملاقات ہوتی۔ اٹھارہ میں سے پانچ آدمی ساتوں دن کام کرتے تھے۔ باقی اتوار کو گھر پر ہی ہوتے تھے۔ سارا دن میلے کا سماں ہوتا۔ خط پتر لکھنے لکھانے، ایک دوسرے کے قرض چکانے، مرچ مسالا مانگنے اور کپڑے دھونے دھلانے میں اوپر نیچے آتے جاتے رہتے۔ مگر دن میں کم از کم دو موقعے ایسے ہوتے تھے جن میں سب ایک ساتھ حصہ لیتے۔ پہلے فلم شو پر جانا ہوتا۔ ہمارے علاقے میں سکھوں نے ایک سینما کرائے پر لے کر اتوار کو دیسی فلمیں چلانی شروع کر دی تھیں۔ بعد میں انھوں نے سینما خرید لیا اور ساتوں دن اپنی فلمیں چلانے لگے۔ مگر پہلے پہل صرف اتوار کے دن دو فلموں کے چار شو ہوتے تھے۔ ہمارے لوگوں کی ساری آبادی وہاں پر موجود ہوتی تھی۔ کام والے کام اور ہمارا اپنے بستر اور نمازی نماز چھوڑ کر وہاں پہنچے ہوتے۔ کئی سو لوگوں کا مجمع ہوتا۔ آج کل تو ہر قسم کی آزادی ہو گئی ہے۔ جس فلم شو میں دل کیا جا کر گھس گئے۔ انگریزی، جرمنی، امریکی۔ ایسی ایسی فلمیں کہ دیکھ کر ہوش خراب ہو جائیں۔ مگر ان دنوں میں اتوار کا یہ فلم شو سارے ہفتے کا سنٹر ہوتا تھا۔ ہم لوگ سات دن اس شو کا انتظار کرتے

رہتے تھے۔ دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر ہم سب کے سب کپڑے بدلتے اور نیچے میر لوریوں کے کمرے میں جمع ہو جاتے۔ شو چار بجے شروع ہوتا تھا اور تین بجے ہمارا گھر سے چلنے کا وقت مقرر تھا۔ پندرہ منٹ پہلے ہی ہم دیر کرنے والوں کو نیچے سے آوازے لگانے شروع کر دیتے۔ دو دو چار چار کر کے جانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ شو کے لیے ہم سب اکٹھے چلتے۔ اسی میں اپنی حفاظت تھی۔ آخر پورے تین بجے ہم تیرہ کے تیرہ صاف ستھرا لباس اور چمکتے ہوئے بوٹ پہن کر باہر نکلتے اور سینما کی طرف چل پڑتے۔ سڑکوں پر اس وقت ہر طرف سے گروہ کے گروہ سینما کی طرف جا رہے ہوتے تھے۔ پولیس والوں کو اور گوروں کو یہ پتا ہی نہ چلتا کہ کون سے قانونی ہیں اور کون سے غیر قانونی۔ اتوار کے دن سب کو علم ہوتا تھا کہ آج ہمارے لوگوں کا فلم شو ہے اور بڑا مجمع ہو گا۔ مجمع پر یہ لوگ ہاتھ نہیں ڈالتے۔ یہ بڑی مکار قوم ہے۔ اندر اندر سے اپنا کام کرتے ہیں اور مطلب نکال لیتے ہیں۔ اتوار کے دن ہم سب ایک ہوتے تھے، کیا قانونی اور کیا غیر قانونی۔ مگر آپس میں ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر پہچان جاتے تھے کہ غیر قانونیوں کی چال ڈھال ہی مختلف ہوتی ہے۔ آج بھی میں کسی دو چار کے گروہ کو فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے دیکھ لیتا ہوں تو مجھے پتا چل جاتا ہے۔ یہ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ لگ کر چلتے ہیں اور اس کوشش میں رہتے ہیں کہ ایک دوسرے سے باتوں میں لگے رہیں۔ اور ایک خاص طریقے سے سر نیچے ڈال کر ادھر ادھر دیکھتے ہیں جیسے کسی چیز کی آڑ سے دیکھ رہے ہوں، مگر آنکھ نہیں ملاتے۔ آج بھی جب ہم اس حالت سے نکل آئے ہیں اور ہم نے جایداد بنا لی ہے اور اچھی ملازمت اختیار کر لی ہے، ہمارے طور طریقے

سے شاید وہ بات نہیں گئی۔ اپنے کسی باعزت آدمی سے ملتے ہیں تو دل میں یہی کھٹکا رہتا ہے کہ کہیں اس نے ہماری اصلی پہچان نہ کر لی ہو۔ عزت کے نشانوں کو مٹانا آسان کام نہیں۔ میں کہتا ہوں عزت خواہ جسم کی ہو خواہ جان کی ایک لعنت ہے اور جرم ہے اور کسی کے حق میں نہیں آنی چاہیے۔ پچھلے سال میں چھٹی پر واپس وطن گیا تو ساتھ ایک کار لیتا گیا۔ کار ساتھ لے جانے کی ہم کو چھوٹ ہے۔ اپنے بھائی بند بڑی عزت کے ساتھ پیش آئے۔ مگر میں نے دیکھا کہ شہروں میں اچھے اچھے سرکاری ملازم اور پڑھے لکھے لوگ ہمیں حقارت اور نفرت سے دیکھتے تھے۔ میں کہتا ہوں یہ لوگ اپنی پڑھائی کے باوجود کوئی علم نہیں رکھتے۔ ان کو اس بات کا پتا نہیں کہ یہ عزت اور امارت کا معاملہ نہیں بلکہ عزت کا معاملہ ہے۔ جب لوگ اپنے گھر بار کو چھوڑ کر نکل جاتے ہیں تو نئے ملک میں ان کے پاس صرف ایک چیز کی کمی رہ جاتی ہے۔ محنت ان کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور دولت آتی جاتی رہتی ہے۔ مگر جس چیز کا وجود نہیں ہوتا وہ عزت ہوتی ہے۔ اپنے شہر میں دو وقت کی روٹی ملے یا نہ ملے، عزت جد پر قائم ہوتی ہے۔ بے وطنی میں کوئی پہچان نہیں ہوتی، صرف اپنی جان ہوتی ہے۔ جن لوگوں نے کبھی اپنا گھر نہیں چھوڑا انھیں اس بات کا علم نہیں، ان کے حق میں یہ نہیں آتا کہ ہمارے اوپر ہلکی نظر ڈالیں۔ ہم نے یہاں ایک پودا لگایا ہے، اور ایک پوری آبادی کے لیے عزت کی صورت پیدا کی ہے۔ اس کام میں ایک عمر ضائع ہو گئی ہے۔ مگر جن دنوں کی میں بات کر رہا ہوں ان دنوں میں صرف ایک فلم شو ہماری عزت اور آزادی کا مرکز ہوتا تھا۔ گوروں کے اس گڑھ میں ہمارے کئی سو آدمیوں کا مجمع کھلے بندوں سینما کے آگے چلتا پھرتا تھا۔ کسی کا کوئی لباس کسی کا کوئی کوٹ

پتلون، پاجامہ، شلوار، کرتا، کوئی روک ٹوک نہیں، جو کسی کا دل چاہا پہن کر آ گیا۔ لاؤڈ اسپیکر پر اردو پنجابی کے گانے چل رہے ہوتے تھے جن کی آواز دور دور تک جاتی تھی۔ کوئی ڈر فکر نہیں، سب ایک دوسرے سے ہنستے بولتے تھے، قہقہے لگاتے تھے، پیچھے کی خبریں چلتی تھیں، کون آ رہا ہے کون جا رہا ہے، کون پکڑا گیا، کون جرمنی رکا ہوا بیٹھا ہے، کس کا ایجنٹ اس کی جان ماری کر رہا ہے، کرنسی کی بلیک میں کون سب سے زیادہ پیسے دیتا ہے، کون سی فیکٹری میں نوکریاں نکل رہی ہیں۔ تبادلۂ خیال کا موقع ہوتا تھا۔ کچھ گورے ادھر سے گزرتے ہوئے ٹھہر جاتے تھے اور ہمارے ہجوم کو دیکھنے لگتے تھے۔ پولیس کے ایک دو سپاہی بندوبست کے لیے موجود ہوتے تھے، مگر ایک طرف ہو کر خاموشی سے کھڑے رہتے تھے۔ کبھی کوئی مشہور فلم آتی تو ٹکٹوں کے لیے مار دھاڑ شروع ہو جاتی۔ پھر سپاہی آگے آ جاتے تھے۔ مگر ڈنڈا چلانا ادھر کے سپاہیوں کا کام نہیں، بس ہاتھ ہلا کر اور منہ سے بول کر بندوبست کر دیتے ہیں۔ ہال کے اندر اور ہی سماں ہوتا تھا۔ مشہور گانوں کے ریکارڈ چلتے تھے۔ لتا منگیشکر، محمد رفیع، نور جہاں۔ فلم شروع ہوتی تو دنیا ہی بدل جاتی۔ اپنے ایکٹر اور ایکٹرسیں۔ اپنی بات چیت۔ اپنا ناچ گانا۔ اپنے ہنسی مذاق۔ اپنی اسٹوری۔ اپنے گھر بار کے منظر۔ ایسا لگتا تھا کہ اپنے وطن میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ فلم بھی کیا عجیب چیز ہوتی ہے۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ میں اسٹوری میں بالکل گم ہو گیا۔ جب ہال میں روشنی ہوئی ہے تو پھر خیال آیا کہ میں کس جگہ پر بیٹھا ہوا ہوں۔ مگر خیال کو برابر ہونے میں کئی سیکنڈ لگ گئے۔ عجیب کیفیت ہوتی تھی۔ دردناک فلم ہوتی تو بہت سے لوگ رونے لگ جاتے۔ ہال میں جب ناکوں کی سُوں سُوں کی

آواز آتی تو پتا چل جاتا کہ رو رہے ہیں۔ مگر میں کبھی نہیں رویا۔ میں فلم میں خواہ کتنا ہی گم ہو جاؤں مجھے یہ خیال رہتا ہے کہ یہ ایک اسٹوری ہی ہے۔ مگر ایک بات میں نے یہاں آکر دیکھی ہے۔ بے وطنی کے اندر دل بہت نرم ہو جاتا ہے۔ اپنا گھر بار اور اپنے بیوی بچے جن کو پہلے کبھی آدمی ایسے دل پر نہیں لگاتا تھا اب اس طرح موقع بے موقع یاد آتے ہیں کہ دل ٹکڑے ٹکڑے ہونے لگتا ہے۔ یہاں پر عورتیں بھی مل جاتی ہیں اور بچے بھی، مگر وہ بات نہیں بنتی۔ اپنی زبان کا لطف، اپنی بات چیت اپنا لباس، اپنی اُٹھ بیٹھ، لمبی لمبی دھوپ، اپنی آوازیں، اپنے ہاتھوں کی نرمی، یہ چیزیں نہیں ملتیں۔ بڑے بڑے شہزور میں نے دیکھے ہیں ہر چیز ان کو حاصل ہوتی ہے، ہاتھ میں ہنر اور جیب میں پیسا ہوتا ہے مگر بیٹھے بیٹھے رونے لگتے ہیں، جیسے کوئی مرض لاعلاج ہو۔ جب فلم شو ختم ہوتا اور ہال میں روشنی ہو جاتی تو لوگوں کے چہروں پر ایک رونق ہوتی۔ سینما سے باہر نکلتے نکلتے رونق آدھی رہ جاتی۔ رستے میں ہم فلم اسٹوری کی باتیں کرتے اور اس کے مذاق آپس میں دہراتے ہوئے واپس آتے۔ اس طرح ہمارے ہفتے کا ایک بڑا موقع گزر جاتا۔

گھر واپس آکر ایک بار پھر گھریلو زندگی شروع ہو جاتی۔ آٹھ سے لے کر نو بجے تک رنڈی کا ٹائم مقرر تھا۔ بہت سی ہماری گلی ہی میں رہتی تھیں، اور اتوار کے لیے ہم نے ان کے ساتھ ریٹ اور ٹائم طے کیا ہوا تھا۔ میرے آنے سے پہلے سنا تھا ہر کوئی اکیلا اکیلا پیسے خرچ کرتا تھا۔ پھر سب نے مل کر صلاح کی کہ اس طرح پیسے ضائع کرنے سے کچھ حاصل نہیں۔ حسین شاہ اس تجویز کو پیش کرنے والا تھا۔ یہودی اس کا بڑا لحاظ کرتے تھے، اسی لیے حسین شاہ اکیلا کمرے میں رہتا تھا اور

سفل کرایہ دیتا تھا۔ حسین شاہ کی صلاح سب کی عقل میں آگئی۔ اُس دن کے بعد ایک سسٹم بن گیا۔ سسٹم یہ تھا کہ سب لوگ پیسے ایک جگہ اکٹھے ڈالیں جن کی ادائیگی یکمشت کر دی جائے۔ پھر باری باری سب فارغ ہولیں۔ کوئی نیا گھر میں آتا تو اس کو سسٹم سے مطلع کر دیا جاتا اور باقی اس پر چھوڑ دیا جاتا۔ اگر وہ چاہتا تو سب کے ساتھ شریک ہو جاتا نہ چاہتا تو الگ رہتا۔ آج تک ثاقب کے علاوہ کسی نے انکار نہیں کیا تھا۔ ثاقب کے انکار کرنے پر دل میں سب خوش تھے، کیوں کہ وہ نوعمر لڑکا تھا اور ہم سب اس کو بچوں کی مانند چاہتے تھے۔ حسین شاہ سسٹم کو چلانے کا ذمہ دار تھا۔ تین رنڈیوں کے ساتھ ہمارا کاروبار تھا۔ جو باری باری ایک ایک اتوار کو آتی تھیں۔ چوتھی اتوار کو پھر پہلی کی باری آجاتی تھی۔ اگر مصروفیت کی وجہ سے ایک ہی رنڈی اکٹھی دو راتوں کو چلی آتی تو اس کو کم ریٹ دیا جاتا تھا۔ یہ معاہدہ طے تھا اور حسین شاہ اس پر سختی سے عمل کرواتا تھا۔ رنڈیوں نے جگہ جگہ پر اس قسم کے ٹھیکے کر رکھے تھے۔ ٹھیک آٹھ بجے رنڈی بن سنور کر آپہنچتی۔ گھر والے پہلے ہی اندر بیٹھے انتظار کر رہے ہوتے، گھر میں داخل ہوکر پکارتی "کم آن بوائز، فیڈنگ ٹائم!" اور دوسری منزل پر چڑھ جاتی۔ دوسری منزل پر حافظ آبادیوں کا ایک کمرہ اس مقصد کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ سب آدمی کمرے کے باہر جمع ہو جاتے اور آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگتے۔ مگر جوں جوں کارروائی آگے چلتی ہنسی مذاق بڑھ جاتا اور آوازیں اونچی ہونے لگتیں۔ سب سے پہلے حسین شاہ فارغ ہوتا۔ یہ بات شروع سے تسلیم شدہ تھی کہ حسین شاہ کا پہلا نمبر ہے۔ اس کے علاوہ وہ نمازی بھی تھا۔ حسین شاہ کے بعد دوسرے نمازیوں کا نمبر آتا جو کل چار تھے، تین میرپوری اور چوتھا شیر باز حافظ آبادی۔ نمازی اپنے غسل

کے بے حد پابند تھے اور انھوں نے اپنے اپنے شلنگ پانی گرم کرنے کے میٹر میں پہلے ہی ڈال دیے ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ گھر میں ان کی عزت تھی۔ جب نمازی فارغ ہو جاتے اور غسل کے لیے نیچے چلے جاتے تو پھر باقیوں کی باری آتی۔ جیسے جیسے کوئی کمرے سے باہر نکل کر آتا اس کے ساتھ گندے مذاق کیے جاتے۔ دروازے کے باہر اوپر اور نیچے کی سیڑھیوں تک قطار لگی ہوتی۔ جو کوئی اندر سے نکلتا اس کو پوری قطار کا ٹھٹھا برداشت کرنا پڑتا۔ اس کے باوجود ہر کسی کی یہ کوشش ہوتی کہ پہلے اس کا نمبر آئے، چنانچہ دھکم پیل جاری رہتی۔ مگر اس کا بھی سسٹم طے شدہ تھا۔ حافظ آبادیوں کا کمرہ استعمال ہوتا تھا اس لیے ان کا حق پہلے نکلتا تھا۔ ان کے بعد سنارلی کا حساب ہوتا تھا۔ گھر میں جتنا پرانا کوئی رہنے والا ہوتا اتنا ہی اونچا قطار میں اس کا نمبر آتا تھا۔ سب سے آخر میں بنگالیوں کی باری آتی تھی۔ بنگالی حالانکہ گھر میں کافی پرانے رہنے والے تھے اور اس حساب سے ان کی جگہ قطار کے درمیان میں ہونی چاہیے تھی، مگر ان کو دھکا زوری سے قطار کے آخر میں بھیج دیا جاتا تھا۔ رنڈیوں کو بھی علم تھا کہ بنگالیوں کی حیثیت سب سے چھوٹی ہے۔ چنانچہ ان کے داخل ہوتے ہی رنڈی شور مچانا شروع کر دیتی۔ اندر سے، "جانور — جانور" کی آوازیں آتیں اور رنڈی جلدی ہی بنگالیوں کو فارغ کر کے باہر نکال دیتی۔ پھر وہ غصے میں باہر آتی اور کہتی "حسین شاہ کہاں ہے،" حسین شاہ اگر غسل خانے میں ہوتا تو وہ نیچے جا کر باتھ روم کا دروازہ پیٹتی اور کہتی، "آج کے بعد میں ان جانوروں کی شکل دیکھنے کے لیے تیار نہیں۔ یہ دس دس پونڈ پر بھی ہنگے ہیں۔ سن لیا؟" بنگالی شرمسار ہو کر اپنے حق میں کچھ بولنے کی کوشش کرتے اور پھر اپنے کمرے میں چلے جاتے۔ یہ ذرا ماہرانہ وار کو ہوتا تھا اور ہمارے شغل کا ایک حصہ

بن چکا تھا۔ ہم لوگ بنگالیوں سے دھول دھپا کرتے رہتے تھے، مگر اندر ہی اندر اس معاملے پر ان سے جلتے بھی تھے کہ نہ جانے ان کے پاس کون سا ایسا ہتھیار ہے جو ہمارے پاس نہیں، اور ہنسی مذاق میں ان سے دریافت کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ آخر میں بنگالیوں نے ہمیں اپنا بدلہ لے لیا اور بڑا سخت لیا۔ مگر جب تک آرام سے کام چلتا رہا سب لوگ بنگالیوں سے فائدہ اٹھاتے رہے۔

اتوار کا دن آدھی رات تک چلتا رہتا۔ نو بجے کے بعد غسل کے لیے قطار لگ جاتی۔ ایک ڈیڑھ گھنٹہ اسی میں گزر جاتا۔ نمازی پہلے غسل سے فارغ ہو کر نماز ادا کرتے۔ اتوار کا دن چونکہ عبادت کا ہوتا دہ دل لگا کر عبادت کرتے۔ ان کے کمروں سے دیر تک دعا اور استغفار پڑھنے کی آوازیں آتی رہتیں۔ باقی لوگ غسل سے فارغ ہو کر ٹولیوں میں بٹ جاتے اور ایک دو کمروں میں بیٹھ کر تاش کی بازی لگا لیتے۔ اس وقت ہم میں سے کئی ایک کے ایجنٹ اپنا ہفتہ وار قرض وصول کرنے کے لیے آ پہنچتے۔ کبھی کبھی تو تو مَیں مَیں ہوتی، مگر یہ لوگ اپنے پیسے چھوڑ کر نہ جاتے۔ ان کے جانے کے بعد تاش کی باری جاری رہتی۔ ساتھ ساتھ ہلکی ہلکی گفت و شنید بھی ہوتی رہتی۔ خبر اخبار، پچھے کی باتیں، زمینوں کی قیمت، فصلوں کا حال، مہنگائی کا ذکر جیسے جیسے کوئی نیند اور تھکاوٹ سے مغلوب ہو جاتا اٹھ کر سونے چلا جاتا۔ وہ عجیب اداسی کا وقت ہوتا۔ مکان پر خاموشی چھا جاتی اور ہماری آوازیں آہستہ آہستہ کمزور پڑنے لگتیں جیسے کوئی چیز اندر سے نکل گئی ہو۔ اس طرح اتوار کا دن اپنے خاتمے کو پہنچتا۔ پھر اگلی اتوار کے انتظار میں سات دن کی روٹین تیار ہو جاتی۔ وقت کا پتا بھی نہ چلتا۔

جب تک وقت آرام سے نکلتا گیا یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا۔ مگر

سال سوا سال کے بعد ہمارے گھر میں ایک ایسی تبدیلی آئی کہ سارا نقشا ہی بدل گیا۔ ایک دن میں کام سے واپس آیا تو گھر میں داخل ہوتے ہی میں نے محسوس کر لیا کہ کوئی بات ہے۔ اوپر گیا تو حسین شاہ کے کمرے سے ایک عورت کے بولنے کی آواز آئی۔ ثاقب اپنے اٹک سے اکثر کر میرے کمرے میں آیا اور بولا کہ حسین شاہ ایک گوری عورت کو اپنے ساتھ لے آیا ہے۔ ہم دونوں خاموشی سے بیٹھ گئے اور حسین شاہ کے کمرے کی دیوار سے کان لگا کر سننے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد غلام محمد بھی آ پہنچا۔ غلام محمد نے کمرے کی بتی جلائی تو میں نے اور ثاقب نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اس کو شور نہ کرنے اور اشارے سے بتی بجھانے کو کہا۔ غلام محمد کی زندگی سیٹ ہو چکی تھی۔ آج اس تبدیلی کو دیکھ کر اس کی حرکت میں فرق آ گیا۔ وہ بے بھی سے کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ پھر ہمارے اشاروں کو دیکھ کر اس نے بتی بجھا دی اور ہمارے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ ہم نے سرگوشیوں میں اسے مطلع کیا کہ حسین شاہ ایک گوری عورت کو لے آیا ہے جو اس وقت اس کے کمرے میں ہے۔ غلام محمد کی آنکھیں پھٹ گئیں، اس نے پوچھا "رنڈی ہے؟" اور کان دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ ہم تینوں دیر تک بیٹھے آوازیں سنتے رہے۔

حسین شاہ اَن پڑھ تھا، مگر انگریزی میں اپنا کام خوب چلا لیتا تھا۔ زیادہ تر آوازیں حسین شاہ کی باتوں کی آ رہی تھیں۔ مگر بیچ بیچ میں عورت بھی ایک دو لفظ بول دیتی تھی۔ جب عورت کی پتلی سی آواز آتی تو ہمارے کانوں کا سارا زور اس طرف لگ جاتا۔ ہمیں کسی بات کی سمجھ نہ آ رہی تھی، مگر جب وہ بولتی تو ہمارے دل دھک دھک کرنے لگتے۔ غلام محمد اپنے سیٹ کام کا سچ بھول چکا تھا۔ کھانے پینے کا بندوبست کرنا بھی کسی کو یاد نہ رہا تھا۔ کیوں کہ کھانے پکانے سے بتی کی روشنی اور برتنوں

کی کھڑک ہونے کا اندیشہ تھا، اور ہماری حالت ایسی تھی کہ جیسے ہمارے ہاتھ پیر جکڑ گئے ہوں، اور ذرا سی حرکت ہوئی تو آوازیں آنی بند ہو جائیں گی اور عورت وہاں سے اٹھ کر بھاگ جائے گی۔ غلام محمد بار بار پوچھ رہا تھا، "رنڈی ہے؟"

ہم میں سے کسی کو معلوم نہ تھا۔ ہم کبھی ہاں میں اور کبھی نہ میں سر ہلا کر جواب دیتے۔ تھوڑی دیر کے بعد غلام محمد نے پوچھا، "یہ یہاں رہے گی؟"

ہمیں محسوس ہوا کہ جیسے یہ سوال پہلے ہی ہمارے دل میں تھا۔ ہمارا دل کہتا تھا کہ یہ رات کو یہاں رہے گی، مگر ہمیں یقین نہ آتا تھا۔ اس گھر کے اندر کسی عورت نے رات بسر نہ کی تھی۔ ہم نے کئی گوری عورتوں کو اپنے آدمیوں کے ساتھ گھومتے پھرتے ہوئے دیکھا تھا، مگر ہمیں علم تھا کہ وہ رنڈیاں تھیں۔ ہمارے فہم میں نہیں آتا تھا کہ کوئی ایک یہاں آکر رہنا شروع کر دے گی۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا یہ خیال ہَوّے کی طرح ہمارے دل کے اوپر بیٹھتا گیا۔ ہمارے سانس بالکل رُک گئے اور جان کانوں میں آگئی۔ باتوں کی آواز اسی طرح ٹھہر ٹھہر کر آرہی تھی۔ ہمیں اس سے غرض نہیں تھی کہ کیا باتیں ہو رہی ہیں یا دیوار کے اس طرف کیا کچھ جاری ہے۔ ہمارے سامنے صرف ایک سوال تھا، کہ کیا یہ عورت یہاں رہے گی؟ اس ایک بات پر ہمارے گھر کے نظم و ضبط کا انحصار تھا۔ سننے میں یہ بات بے وقوفی کی لگتی ہے مگر اس وقت شاید قدرت کی طرف سے ہمارے دل میں آنے والے واقعات کا ہلکا سا علم ڈالا جا رہا تھا۔ ہم دو ڈھائی گھنٹے تک اسی طرح اندھیرے میں دیوار کے ساتھ جُڑ کر بیٹھے رہے۔ حسین شاہ کے کام پر جانے کا وقت دیر ہوئی نکل چکا تھا۔ بھوک کی وجہ سے ہمارے پیٹ گڑگڑانے لگے تھے، مگر کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ یکایک باتوں کی آواز بند ہو گئی۔ جب کئی منٹ تک آواز نہ آئی تو ثاقب اٹھ کر دبے پیروں

دروازے تک گیا۔ واپس آکر اُس نے ہمیں بتایا کہ حسین شاہ کے دروازے کے نیچے روشنی بند ہو چکی ہے۔ ہم دنگ رہ گئے۔ حسین شاہ اور وہ عورت بتی بجھا کر سو چکے تھے۔ حسین شاہ نے ہمارے ہوش میں ایک دن بھی کبھی کام سے ناغہ نہیں کیا تھا۔ آہستہ آہستہ ہمارے ہاتھ پیر کھلنے لگے۔ ہم تینوں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ پھر غلام محمد نے جا کر بتی جلائی۔ میں آہستہ آہستہ قدم رکھتا ہوا باہر نکلا اور کھانا پکانے کا بندوبست کرنے لگا۔ مگر ہماری آنکھیں اور ہمارے کان حسین شاہ کے دروازے پر لگے تھے، جیسے کہ اس دروازے کے پیچھے جو واقعہ ہوا تھا اُس سے ہماری دنیا بدل گئی ہو۔ نیچے کی منزلوں پر بھی یہی حالت تھی۔ ابھی تک کوئی سویا نہ تھا۔ دبے دبے پیر سب چل پھر رہے تھے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ نیچے رہنے والا کوئی ہماری سیڑھیوں تک آیا اور ایک دو منٹ کھڑا رہنے کے بعد واپس ہو گیا۔ کانا پھوسی کی آواز ہر طرف سے آرہی تھی۔ مکان پر خاموشی چھائی ہوئی تھی، مگر مکھیوں کے چھتے کی طرح اس کے اندر بے حساب حرکت تھی اور اس کی گونج بھری ہوئی تھی۔ جب ہم کھانے کے لیے اپنے گدّوں پر بیٹھے تو ہمیں پتا چلا کہ ثاقب کو آج کھانا نہیں ملا۔ اُس نے ہمیں بتایا کہ حسین شاہ نے کھانا پکایا تھا مگر اٹھا کر اپنے کمرے میں لے گیا تھا۔ ثاقب اپنے اٹک میں ہی بیٹھا رہا۔ ہم نے اپنی روٹی میں سے آدھی آدھی اُسے کھانے کے لیے دے دی۔ یہ پہلی بار تھی کہ حسین شاہ نے شام کے وقت نہ غرارے کیے، نہ وضو کیا اور نہ ہی نماز ادا کی۔ غلام محمد نے کھانا کھاتے ہوئے ثاقب سے کہا، "تم ہمارے ساتھ شریک ہو جاؤ۔" ثاقب نے سر ہلا دیا۔ اُس دن سے ثاقب کھانے میں ہمارے ساتھ شریک ہو گیا۔ ہمیں خریداری کا فکر نہ رہا ثاقب ہم تینوں کی خریداری کر کے لانے لگا اور غلام محمد نے اس کے حصّے میں سے آدھا راشن خود کھانا شروع کر دیا۔ اس طرح سب کا کام

چل گیا۔

اگلے روز حسین شاہ ڈاکٹر کے پاس گیا اور تین دن کے لیے بیماری کا پرچہ لے آیا۔ یہ پرچہ اس نے ایک حافظ آبادی کے ہاتھ اپنے فورمین کو بھیج دیا۔ حسین شاہ سے گھر میں کسی نے پوچھنے کی جرأت نہ کی۔ تین دن تک حسین شاہ کا وہی طریقہ رہا۔ وہ صرف رفع حاجت کے لیے نکلتا یا پھر کھانا پکانے باہر آتا۔ دونوں وقت وہ کھانا پکا کر کمرے میں لے جاتا اور دروازہ بند کر لیتا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ثاقب کو بالکل فراموش کر چکا ہے۔

تین دن تک عورت کو بھی کسی نے نہ دیکھا۔ چوتھے دن ہفتے کا روز تھا۔ اُس روز وہ باہر نکلی اور وہ چار منٹ ہماری منزل پر پھرتی رہی۔ میں جب کام سے واپس آیا تو وہ چولھے کے پاس کھڑی ثاقب سے باتیں کر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ اندر چلی گئی۔ پتلی سی نوجوان عورت تھی۔ اس کے بھورے بال تھے اور بڑی بڑی بلی کے رنگ کی آنکھیں تھیں۔ اُس نے ڈھیلا ڈھالا لمبا سا چغا پہنا ہوا تھا جو پاؤں تک لٹک رہا تھا۔ پیروں میں موٹی جرابیں اور سلیپر تھے۔ وہ کمزور لوگوں کی طرح آہستہ آہستہ چل کر حسین شاہ کے کمرے میں چلی گئی۔ ثاقب اُچھل کر اپنے اٹک میں جا چڑھا۔ دو منٹ کے بعد وہ چھلانگ لگا کر وہاں سے اترا اور ہمارے کمرے میں آ گیا۔

"کیا کہہ رہی تھی؟" میں نے پوچھا۔

ثاقب کے چہرے کا رنگ فق تھا اور مُنہ سے بات نہیں نکلتی تھی۔

"کچھ نہیں۔" وہ بولا۔

"کیوں نہیں۔" میں نے سختی سے پوچھا۔ "تم سے باتیں کر رہی تھی۔"

تھوڑی دیر تک ثاقب سانس برابر کرتا رہا۔ "اس کا نام میری ہے۔" وہ بولا۔

"کیا کہہ رہی تھی؟" میں نے پوچھا۔
"باتیں کر رہی تھی؟"
"کیا باتیں کر رہی تھی؟"
"اس نے خود ہیلو کر کے مجھے بلایا تھا۔" ثاقب نے کہا۔
"ٹھیک ہے، اس نے خود ہی پہلے تمہیں بلایا تھا۔" میں نے کہا، "مگر کہہ کیا رہی تھی؟"
"پوچھ رہی تھی میں کیا کام کرتا ہوں اور کتنے بجے کام پر جاتا ہوں اور کتنے بجے آتا ہوں۔"
"کیوں؟"
"بس ایسے ہی۔"
"بس ایسے ہی کیوں؟" میں نے پوچھا۔ "اور کیا کہہ رہی تھی؟"
"کچھ نہیں۔"
"کیوں نہیں۔ تم سے لمبی بات کر رہی تھی۔"
ثاقب گھبرا کر سوچنے لگا۔ پھر بولا، "اس کا پیٹ خراب ہو گیا ہے۔"
میں اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ مجھے اس طرح دیکھ کر ثاقب اور بھی گھبرا گیا۔ میں نے اس کی یہ حالت دیکھی تو ہنس پڑا۔ ثاقب کی گھبراہٹ کچھ دور ہوئی۔ وہ بھی ہنسنے لگا۔
"ہمارا کھانا کھا کر اس کا پیٹ خراب ہو گیا ہے۔" ثاقب بولا۔ "کہتی ہے اس کو سالن اور روٹی بہت پسند ہے، مگر مرچوں نے اس کا پیٹ خراب کر دیا ہے۔"
ہم دونوں گدّے پر بیٹھ گئے، مگر ہماری آنکھیں باہر کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ اس کا پیٹ واقعی خراب ہو گیا تھا۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے وہ دو تین بار ٹائلٹ ہو کر آئی۔ جب غلام محمد آیا تو ہم نے اسے یہ بات

بتائی۔ وہ ہمارے پاس بیٹھ گیا اور منہ اٹھا کر دروازے کو دیکھنے لگا جب عورت ایک بار پھر دروازے کے آگے سے گزری تو غلام محمد جھک کر اس کو ٹائلٹ میں جاتے اور دروازہ بند کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر وہ ہماری طرف دیکھ کر بولا۔

"رنڈی ہے۔"

ثاقب نے اسی وقت اُس سے اختلاف کرنا شروع کر دیا مگر غلام محمد اپنی بات پر اڑا رہا۔ اسی دوران میں حسین شاہ خریداری کر کے لوٹ آیا۔ وہ کھانے پینے کی چیزوں کے علاوہ کچھ برتن بھی لے کر آیا تھا۔ اُس شام کو عورت نے چولھے پر اپنا انگریزی کھانا پکایا۔ جب کھانا تیار ہو گیا تو وہ اپنا فرائی پان اٹھا کر کمرے میں لے گئی۔ ہم اپنے کمرے میں ہی بیٹھے یہ کارروائی دیکھتے رہے۔ اُس کے جانے کے بعد ہم اٹھے اور اپنے کھانے کا بندوبست کرنے لگے۔ ہم تینوں چولھے کے پاس کھڑے کھانا پکا رہے تھے کہ وہ برتن دھونے کے لیے باہر آئی۔ اُس نے ہمیں دیکھ کر ہیلو کیا۔ ہم تینوں نے ہیلو کر کے اُس کا جواب دیا۔ وہ خاموشی سے ٹونٹی کے نیچے پلیٹیں اور فرائی پان دھوتی رہی۔ جب دھو چکی تو جاتے جاتے اُس نے مسکرا کر ہماری جانب دیکھا۔ پھر اُس نے کمرے میں جا کر دروازہ بند کر لیا۔ ہم تینوں اسی طرح کھڑے رہے۔ ہماری حرکت میں کمی آ گئی، ہاتھ چلتے چلتے آہستہ ہو گئے اور زبانیں بند ہو گئیں۔ جب سالن کے لگنے کی بو آنے لگی تو پھر مجھے اس میں پانی ڈالنا یاد آیا۔ مگر ہماری بات چیت اسی طرح رُکی رہی۔ ہمارے سارے خیالات ایک دم غائب ہو گئے تھے۔ کسی پر شکوک ہو کر دل کیسے کیسے رنگ بدلتا ہے۔ وہ رنڈی تھی یا کون تھی، مگر اس نے ہمارے ساتھ کھانا پکایا تھا اور برتن دھوئے تھے اور اپنے لوگوں کی طرح ہمیں دیکھ کر مسکرائی تھی۔ زبان سے نکلا ہوا ایک لفظ یا چہرے کی مسکراہٹ

کیسے آدمی کو سامنے آتی ہے۔ اس عورت سے سامنا کر کے ہمیں گویا اپنے آپ کا احساس ہوا تھا۔ ہمیں ایسا لگا جیسے اس وطنِ غیر سے پہلی بار ہماری واقفیت کا آغاز ہوا ہے۔ ہم نے خاموشی سے کھانا کھایا اور بتی بجھا کر سو گئے۔

یہ حقیقت ہے کہ اس وطن سے ہماری واقفیت کا آغاز اُسی شام سے ہوا۔ اگلے دن اتوار کا روز تھا۔ میری کا پیٹ زیادہ خراب ہو گیا۔ اس نے آہستہ آہستہ سیڑھیاں اتر کر اپنے ڈاکٹر کو ٹیلی فون کر دیا۔ سارے گھر پر خاموشی چھا گئی۔ ہر ایک نے ٹیلی فون پر میری کی آواز سنی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس ٹیلی فون سے کسی نے ڈاکٹر کے ساتھ بات کی تھی۔ اتوار کا روز تھا مگر کسی طرف سے آواز نہ آتی تھی۔ تینوں منزلوں پر لوگ دبک کر بیٹھے ڈاکٹر کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ کچھ دیر کے بعد بنگالیوں نے اٹھ کر صفائی شروع کر دی۔ پانچ دس منٹ کے اندر اندر انھوں نے باورچی خانہ اور سیڑھیاں اور غسل خانہ چمکا کر رکھ دیا۔ اس کے بعد ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ سب کی نظریں دروازے پر لگی تھیں۔

ایک گھنٹے کے بعد ڈاکٹر آ پہنچا۔ اس نے دروازے کی گھنٹی بجائی تو کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلا جبین شاہ جلدی سے اٹھ کر ٹائلٹ کے بہانے اندر گھس گیا۔ ہم تینوں اپنے دروازے سے ہٹ کر بیٹھے تھے تاکہ باہر سے گزرنے والے کو نظر نہ آئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد دوبارہ گھنٹی بجی تو نیچے والوں نے ایک بنگالی کو کمرے سے باہر دھکا دے دیا۔ بعد میں میر پوریوں کی زبانی سنا کہ بنگالی دروازہ کھولتے کھولتے دروازے کے پیچھے چھپ گیا۔ ڈاکٹر اپنا بیگ اٹھا کر اندر آیا تو کچھ دیر تک اِدھر اُدھر دیکھتا رہا پھر بنگالی دروازے کے پیچھے سے نکلا۔ ڈاکٹر نے میری کا نام لیا تو بنگالی نے اشارے سے اُسے اوپر جانے کو کہہ دیا۔ ڈاکٹر سیڑھیاں چڑھ کر

ہماری منزل پر آ پہنچا۔ میری اپنے دروازے کے آگے کھڑی تھی۔ پانچ منٹ میں ڈاکٹر اس کا ملاحظہ کر کے اور دوائی کی پرچی لکھ کر گھر سے سیدھا باہر چلا گیا۔ اس نے اِدھر اُدھر نظر ڈال کر بھی نہ دیکھا۔

آہستہ آہستہ گھر میں اِکّا دُکّا شور اٹھنے لگا۔ پھر یکایک گویا سب اٹھ کھڑے ہوئے، جیسے سکتے کی حالت سے حرکت میں آ گئے ہوں۔ اتوار کا دن اب شروع ہو گیا۔ اُوپر نیچے دبڑ دبڑ سیڑھیاں اترنے اور چڑھنے کی آوازیں آنے لگیں۔ کھانے کے برتن کھڑکنے لگے اور مسالا بھوننے کی خوشبو گھر میں پھیل گئی۔ میرپوریوں اور حافظ آبادیوں اور بنگالیوں کی مختلف زبانوں میں باتیں کرنے کی آوازوں سے گھر بھرا ہوا تھا۔ حسین شاہ ڈاکٹر کی پرچی لے کر دوائی لینے چلا گیا تھا۔ ہم لوگوں نے پروگرام کے مطابق دوپہر کا کھانا کھایا، بوٹ چمکائے، اور تیار ہو کر فلم شو دیکھنے کے لیے چل پڑے۔

آج حسین شاہ ہمارے ساتھ نہیں تھا۔ وہ اور میری گھر میں رہ گئے تھے۔ مگر ہم سب آج بہت خوش تھے۔ ہمارے قدم زمین پر مضبوطی سے جم رہے تھے اور ہماری آنکھوں میں بے باکی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ہمارے دلوں کو ایک عجیب سی ڈھارس مل گئی ہو۔ شو ختم ہوا تو ہم وہاں سے فلم سٹوری کی باتیں اور ہنسی مذاق کرتے ہوئے واپس لوٹے۔ مگر ابھی ہم آدھے رستے میں ہی تھے کہ ہماری باتیں رک گئیں، جیسے ہم سب کو ایک ساتھ کوئی بات یاد آ گئی ہو۔ جیسے جیسے گھر قریب آتا جاتا تھا ہمارے اوپر خاموشی چھاتی جا رہی تھی۔ آخر جب ہم گھر پہنچے تو دروازہ کھول کر چُپ چاپ سب کے سب جا کر میرپوریوں کے ایک کمرے میں بیٹھ گئے اور انتظار کرنے لگے۔ ہم میں سے کسی نے اس بات کا ذکر نہ کیا تھا، مگر سب کو پتا تھا کہ ہمارے دل پر کیا بات ہے اور کس بات کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد غلام محمد اٹھا اور بھاگتا ہوا سیڑھیاں چڑھ گیا۔ اُوپر سے وہ اپنے

کمرے میں پھر پھرا کر واپس آ گیا۔

"کمرے میں ہیں۔" اسس نے واپس آ کر کہا اور اپنی جگہ پر جا بیٹھا۔ کچھ وقت اور گزر گیا۔ ہم میں سے ایک دو نے کوئی چھوٹی سی بات کی، پھر خاموشی ہو گئی۔ وقت گزرتا جا رہا تھا اور دل میں کوئی اسکیم نہ آ رہی تھی کہ اس صورت سے کیسے نپٹا جائے۔ ثاقب اٹھا اور کمرے سے نکل گیا۔ اس کی طرف کسی نے دھیان نہ دیا۔ وہ ہمارے ٹولے میں شریک نہیں تھا۔ وہ اوپر گیا اور اپنے اٹک میں چڑھ کر ادبی رسالہ پڑھنے لگا۔ ہمیں علم تھا کہ میری رنڈی ہے یا اسی قسم کی کوئی عورت ہے۔ مگر اس کے آنے سے گھر میں فرق آ گیا تھا۔ اس کے کھانا پکانے سے اور ٹائلٹ جانے اور ٹیلی فون کرنے اور حسین شاہ کی عورت بن کر رہنے سے گھر کی صورت دوسری ہو گئی تھی۔ اس صورت میں ایک رنڈی کا گھر میں داخل ہونا بے جا سی بات لگتی تھی۔ وہ خواہش جو ہر اتوار کی شام کو ہمارے اوپر سوار ہوتی تھی اس وقت غائب تھی۔ اب یہ بات ہمارے لیے مسئلہ بن گئی تھی۔ آخر حسین شاہ اوپر سے سیڑھیاں اتر کر آیا تو اس کے حل کی کوئی صورت نکلی۔ حسین شاہ آ کر ہمارے پاس بیٹھ گیا۔ میری کی آمد کے بعد یہ پہلی بار تھی کہ حسین شاہ ہمارے ساتھ آ کر بیٹھا تھا۔ کئی منٹ تک وہ ہماری طرح چپ چاپ بیٹھا مونچھوں کو آہستہ آہستہ انگلیوں سے مروڑتا اور ہوا میں دیکھتا رہا۔ پھر ایک حافظ آبادی نے اس سے بات کی جس پر ہم سب چونک پڑے۔

"شاہ جی، اب بی بی کا کیا حال ہے؟"

کئی سیکنڈ تک خاموشی رہی، جس اثنا میں حسین شاہ حافظ آبادی کا منہ دیکھتا رہا۔ پھر ایک ساتھ کئی لوگوں کی ملی جلی آواز پیدا ہوئی، جیسے حال پوچھ رہے ہوں۔

حسین شاہ نے سر ہلا کر جواب دیا "اب ٹھیک ہے۔"

یہ کہنے کے بعد وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

"یہیں پر کر کرا لینا" وہ ہاتھ سے اشارہ کر کے بولا "اور شور نہ کرنا"

حسین شاہ بات ختم کر کے کمرے سے نکل گیا۔ اب سب لوگوں نے باتیں شروع کر دیں۔ خاموشی کا دور ٹوٹ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک بوجھ ہمارے دل سے اُتر گیا ہے۔ ایک بنگالی کو تیار کیا گیا کہ وہ گھنٹی بجنے پر بھاگ کر جائے گا اور دروازہ کھولے گا۔ دروازہ کھولتے ہی ہونٹوں پر انگلی رکھ کر چُپ رہنے کا اشارہ کرے گا۔ پھر وہ خاموشی سے اس کی پہلی منزل پر ہی میر پوریوں کے ایک کمرے میں لے جا کر چھوڑ دے گا۔ باہر کوئی قطار نہیں بنے گی بلکہ سب اسی کمرے میں جمع رہیں گے جہاں اب بیٹھے تھے، اور ایک ایک کر کے جا کر فارغ ہو لیں گے۔ یہ ساری اسکیم بنی اور ہدایت دی گئی اور ہنسی مذاق کا سلسلہ جاری رہا، مگر اس کے باوجود کوئی ایک ایسی بات تھی جو اندر سے غائب ہو گئی تھی، اس ساری کارروائی میں وہ جذبہ نہیں رہا تھا۔ سب لوگوں کو اس کا احساس تھا، سب سے زیادہ مجھے اور غلام محمد کو تھا۔ ہم دونوں کی حیثیت دوسروں سے مختلف تھی۔ ہمیں اُس وقت اس بات کا پتا چلا جب باتوں کے شور میں اچانک ہماری نظریں ایک دوسرے سے ٹکرائیں۔ ہم نے اُسی وقت جان لیا کہ ہم دونوں کے دلوں میں ایک ہی بات ہے ہم ایک ساتھ اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"ہمارا نام کاٹ دو جی" غلام محمد نے ایک میر پوری سے کہا۔ وہ میر پوری ہمارا منہ دیکھنے لگا۔ ہم دونوں کمرے سے نکل کر سیڑھیاں چڑھ آئے۔